Lesson 3: Yusuf (Ayaat 36- 57): Day 12

سُوۡرَةُ یُوۡسُف کی تفسیر

وَمَآ أُبَرِّئُ نَفۡسِيٓۚ إِنَّ ٱلنَّفۡسَ لَأَمَّارَةُۢ بِٱلسُّوٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيٓۚ إِنَّ رَبِّي غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴿٥٣﴾

میں کچھ اپنے نفس کی براءَت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میرا رب بڑا غفور ور حیم ہے"۔

اب یہاں کلام کا صیغہ ہے۔ واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ یہ کس کا کلام ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین کی مختلف رائے ہیں۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ اگر اسے پیچھے سے ملایا جائے تو عزیزِ مصر کی بیوی کا قول ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے اللہ نے اُسکو توبہ کی توفیق دی۔ کسی انسان سے اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اُس سے بھلائی کی اُمید نہ رکھنا یہ بھی غلط ہے۔ تو یہ عزیزِ مصر کی بیوی کا قول ہے۔ اگر پیچھے دیکھیں تو اُس نے کہا کہ میں نے اسکی غیر موجود گی میں کوئی خیانت نہیں کی۔ تو ایک تو شوہر کی غیر موجود گی میں کوئی خیانت نہیں کہ دوسرا یوسف ؑ جیل میں ہیں تو اُن کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ تو یہ قول زیادہ صحیح لگتا ہے کہ یہ عزیزِ مصر کی بیوی کا قول ہے۔ تو کہتی ہے کہ مجھ سے حقیقت میں گناہ ہوا۔ یہ میرے نفس کا غلبہ تھا جو مجھ پر غالب آ گیا اور اُسکی وجہ سے میں اپنے آپ کو بچا نہ سکی۔ کیوں کہ نفس ہوتا ہی برا ہے۔ گناہ کا عمل ہوا یا نہ ہوا اسکو چھوڑ دیں لیکن نفس نے اسکی خواہش تو کر دی تھی۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت یوسف ؑ کا قول ہے۔ اُنکے دلائل کیا ہیں کہ اتنا خوبصورت جملہ وہ عورت کیسے بول سکتی ہے جو گناہ کی دعوت دے۔ تو اس سے پھر اس چیز کا انکار ہوا کہ جو ایک دفعہ گناہ کرے وہ نیک ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ ہم پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ لوگوں سے خطائیں ہوئیں لیکن اللہ تعالیٰ نے

اُنہیں نبوت پہ بھی ڈال دیا۔ تو یہ بات حضرت یوسفؑ کی طرف منسوب کرنی صرف اس وجہ سے کہ یہ بات بہت خوبصورت ہے، تو یہ بات درست نہیں لگتی۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ آتی ہے کہ یوسفؑ تو اُس وقت وہاں نہیں تھے۔ یہ ساری گفتگو ہو جانے کے بعد یوسفؑ کو جیل سے بلایا گیا تھا۔ اُنہوں نے باہر آنے سے انکار کر دیا تھا کہ میں تب تک باہر نہیں آؤں گا جب تک میرا معاملہ صاف نہ ہو جائے۔ لہٰذا عزیزِ مصر کی بیوی کا یہ قول ہے۔ قول کسی کا بھی ہو لیکن بات حقیقت ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے آپ کو نفس کے ہاتھوں میں ڈال دیتا ہے تو نفس کیا ہے امَّارہ۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ۔ نفس انسان کے اندر کی وہ کیفیت ہے جسکو وہ "میں" کہتا ہے۔ جیسے میں نے کھایا، میں نے کیا۔ تو یہ میں نفس ہے۔ قرآنِ پاک میں یہ لفظ بہت جگہ دل کے لیے بھی آیا ہے۔ شخصیت کے لیے اور افراد کے لیے بھی آتا ہے لیکن یہاں اس سے مُراد انسان کے اندر کا وہ جذبہ جو اسے گناہ پہ مائل کرے۔ جب ہم احادیث کو جمع کرتے ہیں تو نفس کی تین قسمیں ملتی ہیں۔

1۔ نفسِ امّارہ جسکا ذکر یہاں آ گیا۔

2۔ نفسِ لوامہ، جسکا تذکرہ سورۃ قیامۃ میں آئے گا۔

3۔ نفسِ مطمَئِنَّہ، جسکا ذکر سورۃ فجر میں آئے گا۔

نفس کی حالتیں کیسی ہوتی ہیں؟ کہ ہر انسان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ اور ایک شیطان مقرر کیا ہوا ہے۔ ہم سب کے اوپر ایک حملہ اندر سے اور ایک باہر سے ہو رہا ہے۔ اندر کا حملہ شیطان کرتا ہے۔ ہمیں بُری باتوں کا حکم دیتا ہے۔ جب بھی ہمارے سامنے نیکی کا کوئی موقع آتا ہے تو شیطان ہمیں

اُس سے روک دیتا ہے، سوچوں میں ڈال دیتا ہے، سستی طاری کر دیتا ہے۔ انسان جب خود کو شیطان کے حوالے کر دیتا ہے تو اُسکا نفسِ امارہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اگر آپ انسان کا اسکیچ بنا کے دیکھیں تو اُسکے دل پہ دو طاقتیں ہیں۔ ایک نیکی کا حکم دیتا ہے اور ساتھ ہی شیطان آ جاتا ہے جو اس سے منع کر رہا ہوتا ہے۔ جیسے فجر کی اَذان سُن کے ایک خیال آتا ہے کہ اُٹھو نماز پڑھو، اور ساتھ ہی یہ خیال آ جاتا ہے کہ سو جاؤ ابھی بڑا وقت پڑا ہے، ابھی صُبح ہونے میں کافی دیر ہے تو یہ شیطان ہوتا ہے۔ وسوسوں کی صورت میں دل و دماغ پہ آتا ہے۔

اور فرشتہ اُسے اچھی باتیں بتا رہا ہوتا ہے۔ اگر ایسے میں انسان فرشتے کی مان لے تو اُس کی اُس سے دوستی ہو جاتی ہے۔ دن بدن اچھی باتیں ماننے سے فرشتے سے دوستی ہو جائے گی اور ایک وقت آئے گا کہ شیطان مایوس ہو جائے گا کہ اس نے تو میری بات نہیں مانی۔

اور اسی طرح جب ہم شیطان کی باتیں مانتے ہیں تو شیطان سے دوستی ہو جاتی ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ فرشتہ نیکی کی بات کہنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ بس اس کیفیت کو سامنے رکھ لیں۔

جس نے فرشتے کی مان لی، بلآخر اُس کا نفس نفسِ مطمعِنَّ بن جائے گا۔ ہم سورۃ فجر میں پڑھیں گے کہ جس نے فرشتے کی بجائے شیطان کی مان لی اُسکا نفس نفسِ امّارہ بن جائے گا۔ نفس پھولنے لگتا ہے۔ نفسِ امّارہ وہ نفس ہے جو سرکشی میں، غصے کے وقت اور خواہش کے وقت انسان کے اوپر سے اُسکا کنٹرول ختم کر دے۔ پھر اگلی کیفیت نفسِ لوامہ کی ہوتی ہے۔ جتنا نفسِ امّارہ بُرائیوں پہ شیر ہوتا ہے اُتنی اندر ایک قوت اُبھرتی ہے جو ملامت کرتی ہے، جو شرم دلاتی ہے۔ ہمیں خود اپنے گناہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ اسکو "لوامہ" کہتے ہیں ہیں۔ مطلب ملامت، اور اپنی زبان میں اسے "ضمیر" کہتے ہیں۔

جتنا انسان کا نفسِ لوامہ مضبوط ہو گا، اُتنا نفسِ امّارہ دبے گا۔ کیوں کہ ایک کام آپ کریں اور بعد میں آپ کی بے عزتی ہو جائے۔ کسی کام کو کرنے کے بعد آپ کو اُس کے بُرے اثرات ملیں۔ تو ایک وقت آئے گا کہ آپ گناہ چھوڑ دیں گے لیکن اگر انسان نفسِ لوامہ کی بار بار کی مداخلت کے باوجود بھی غلط کام کرتا رہے تو نفسِ لوامہ بھی اُس سے روٹھ جاتا ہے۔

یہ بالکل اُس دوست کی طرح ہے جو بار بار آپکو بلائے اور آپ نہ جائیں تو ایک دن وہ کہے کہ جاؤ اب میں تمہیں بُلاتا ہی نہیں۔ نفسِ لوامہ میں انسان آخرت کے لیے جینا چاہتا ہے اور غلط کاموں پہ روکتا ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو نفسِ امّارہ کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے تو ہوتا کیا ہے؟

تفسیر قرطبی کی ایک روایت میں آتا ہے کہ "نفس شیطان کی سواری ہے، جس کے ذریعے وہ انسان میں داخل ہوتا ہے"۔ شیطان انسان کے جسم میں نفس کے راستے سے آتا ہے۔ یہ اتنا ظالم ہے کہ انسان کو کسی قابل نہیں چھوڑتا۔ انسان سراسر غلط کام کر رہا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پھر جیسے ہی جسم کے اندر آتا ہے تو اُسے کنٹرول کر لیتا ہے۔ جیسے ہائی جیکر کسی طرح جہاز میں داخل ہو کے، پائلٹ سے کنٹرول چھین لیتے ہیں، اسی طرح نفسِ امّارہ بھی ہائی جیکر ہے۔ انسان کو ایسی جگہ پہنچا دیتا ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اُسے لگتا ہے کہ مجھے بے عزت کیا، میری قدر نہیں کی، مجھے کچھ سمجھا نہیں۔ اور انسان یہ سب عزت کے نام پہ کر رہا ہوتا ہے۔ اور کرتے کرتے انسان کو زمین پہ گرا دیتا ہے لیکن وہ سمجھتا نہیں۔

اللہ کے نبیؐ نے ایک بار اپنے صحابہ سے پوچھا، ایسے رفیق کے معاملے میں تمہارا کیا معاملہ ہے کہ تم جتنی اُس کی عزت کرو، کھلاؤ، پلاؤ، اُتنا وہ تمہیں مصیبت میں ڈالے۔ صحابہ نے کہا اس سے بھی کوئی بُرا

احسان فراموش ہو گا۔ تو نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اُسکے بارے میں کیا خیال ہے جو تمہارے دل میں رہتا ہے۔ فرمایا انسان کا نفس اس سے بھی بُرا دوست ہے۔ جتنی تم اسکی باتیں مانتے ہو، اُتنا یہ انسان کو ذلیل و رسوا کرتا ہے اور جتنا سکو گھور کے دیکھو یہ ٹھیک رہتا ہے۔ نفسِ امّارہ میں دو بڑی چیزیں یاد کر لیجئے۔ دونوں "ش" سے شروع ہوتی ہیں۔

1۔ شہوت

2۔ شبہات

دُنیادار لوگوں کو "شہوت" میں ڈال دیتا ہے۔ آج سب معلوم ہونے کے باوجود کہ ہمیں قرآن کی ضرورت ہے، لوگ کیوں نہیں آپاتے کہ پیچھے شہوت کا زور ہے۔۔ شیطان آدھے لوگوں کو تو پہلے ہی شہوت کے زور پہ پیچھے رکھتا ہے۔ فجر میں نیند کی شہوت، ظہر میں کھانے پینے کی شہوت، عصر میں شاپنگ اور مغرب، عشاء میں تھکاوٹ کی شہوت۔

باقی آدھے لوگ جو دین پہ آجاتے ہیں۔ اُن کو سمجھ آجاتی ہے کہ یہ ہمارے لیے اکسیجن ماسک کی طرح ہے، ہمیں اسکو لینا ہے تو پھر اُ نکو "شبہات" میں ڈال دیتا ہے۔ جو دین پہ آجاتے ہیں تو اُن کے پاس بھی پینترے بدل بدل کے آتا ہے۔ مثلاً انسان سوچتا ہے کہ دیکھ لو، انکے موٹوز ٹھیک ہیں، جو قرآن پڑھایا جارہا ہے ٹھیک ہے، کہیں یہ ہمارا مسلک تو نہیں بدل دیں گے، یہ ہمیں ہمارے باپ دادا سے دور تو نہیں کر دیں گے۔ اس طرح کے نہ نظر آنے والے شبہ ڈالتا ہے۔ کہ جس کے بعد دین کی بات میں، دین کے کام میں، دین کے راستے میں آتے آتے انسان کے قدم رُک جاتے ہیں۔ کئی قسم کے شبے ڈالتا ہے، کہ کوئی تمہاری قدر نہیں کرتا، تمہاری ٹانگیں کھینچتے ہیں، تمہیں آگے نہیں آنے دیتے۔

جیسے مکہ والے تیرہ سال نبیؐ کے ساتھ رہے۔ شیطان نے اُن کو کیا شبہ ڈالا اور کیا خیال تھا مکہ والوں کو جس نے اُنہیں نبیؐ تک نہیں آنے دیا کہ مکہ والوں کو نبیؐ کا پیغام پسند نہیں تھا، اُنکو اسلام کا پیغام ہی نہیں اچھا لگتا تھا۔ اور مدینہ والوں کی دشمنی پیغمبر سے تھی۔ اللہ کہتے ہیں کہ "یہ انکو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں" لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے نہیں مانا۔

دونوں کا نتیجہ کیا نکلا، مکہ کے بڑے بڑے سر "بدر" میں کچل دیئے گئے اور مدینہ کے منافقوں کو "تبوک" میں جا کے رسوا کر دیا۔ تو اگر ان دو چیزوں، شہوات اور شبہات پہ قابو پا لیا تو ہم خود کو نفس سے بچا لیں گے۔ نفسِ امّارہ کی مرغوب غذا "شرک" ہے۔ شرک سے بات شروع ہوتی ہے، جسکا نقطہ آغاز ناشکری ہوتا ہے۔ انسان پہلے اللہ کی قدر چھوڑتا ہے، پھر اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے پھر ہوتے ہوتے اللہ کے حکموں میں دوسروں کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ انسان شرک سے ہوتے ہوئے پہلے "کبائر" اور پھر "صغائر" کی طرف چل پڑتا ہے اور بُرے سے بُرے کام کرنے لگ جاتا ہے۔ اب کریں کیا؟

اس میں ہر مذہب میں بہت کوششیں کی گئیں۔ لوگ نفس کشی پہ نکل گئے۔ رہبانیت آگئی، خواہشات ختم، شادی نہیں کر سکتے، باسی کھانا کھانا ہے، کپڑے اچھے نہیں پہننے۔ یعنی عیسائیت کے سکالرز جب نفس کو قابو پانے پہ گئے تو اُنہوں نے اسکو بالکل ختم کر دیا۔ آج ہمارے ہاں اسکی بگڑی ہوئی شکل "تصوف" کے شکل میں ملتی ہے۔ تصوف بہت خوبصورت لفظ ہے۔ لیکن ایک خاص طبقہ ایسا آگیا کہ جس نے خود کو نفس کُشی پہ رکھ دیا۔ یہ ایک ایکسٹریم ہے۔

اسلام چاہتا ہے نفس کُشی نہ ہو بلکہ نفس پر قابو ہو۔

اسلام self control سکھاتا ہے self worship نہیں سکھاتا۔

تقویٰ کی لگام ڈال دی جائے تو نفس انسان کے قابو میں آجاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ ایک بگھی کے آگے دو گھوڑے ہیں ایک سفید اور ایک کالا۔ سفید گھوڑا اُڑنا چاہتا ہے اور کالا گھوڑا چاہتا ہے کہ زمین میں دھنس جاؤں۔ آپ اگر سفید گھوڑے کو اچھا کھلاتے پلاتے ہیں تو وہ اُڑنے لگے گا جو کہ مقصود نہیں اور اگر آپ کالے گھوڑے کو زیادہ کھلاتے پلاتے ہیں تو وہ زمین میں گھسے گا اور یہ بھی مقصود نہیں۔ آپ کریں کیا؟ دونوں کو ایک جیسی خوراک دیں۔ پھر نفس کی بگھی سیدھی چلے گی۔ کالا گھوڑا نفسِ امّارہ ہے جو انسان کو بالکل دینا کے ساتھ لے کے جانا چاہتا ہے۔ اور سفید گھوڑا روحانیت کا گھوڑا ہے۔ یعنی روحانی ضروریات اور جسمانی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے اس کے بیچ میں اس بگھی کو چلائیں گے تو بات سچ ہو گی۔

اسکی بہترین مثال نبیؐ تھے۔ آپؐ میں روحانیت بھی عروج پہ تھی اور جسمانیت بھی آپؐ کے اندر بہت خوبصورت تھی۔ آپؐ میں دوسرے مردوں سے زیادہ طاقت تھی۔ آج بھی آپ دیکھیں گے کہ انسان جتنا خود کو گناہوں سے پاک رکھتا ہے اُسکی تمام صلاحیتیں دوسروں سے بڑھ جاتی ہیں اور جو جتنا بُرائی میں، سگریٹ نوشی میں، ڈرگز میں، حرام چیزوں کو دیکھنے میں پڑ جاتا ہے تو اُن کے اندر سے وہ خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ صرف جان چھُڑانے کے لیے نفس کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

لہٰذا نفسِ امّارہ اور نفسِ لوامہ کی جنگ میں ہم نے نفسِ لوامہ کو فاتح بنانا ہے۔ تاکہ بالآخر ہم نفسِ مُطمَعِنّہ بن سکیں۔ ہماری موت کی صورت میں پُکار لگے۔۔ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾

چل اپنے رب کی طرف، تیرا رب تجھ سے راضی ہے۔ ہم اُس صورت میں اللہ کے پاس جائیں گے جس صورت میں ہم دنیا میں آئے تھے، معصوم، بھولے بھالے، صاف دل کے ساتھ۔ جب یہ کیفیات دل میں آتی ہیں تو انسان نفسِ مُطمئِنَّہ بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے نفس پہ قابو پانے والا بنادے۔ اور نفسِ امّارہ کو دبانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسکی کم مانو۔ اگر اپنے بچوں میں یہ چیز ختم کرنا چاہتے ہیں تو اُن کی کم باتیں مانیں۔ آج ہمارے آس پاس جو حالات ہیں وہ نفسِ امّارہ کو موٹا کرنے والے ہیں۔ تو اپنے نفس کو دبائیں، اسکو مارنا نہیں ہے۔ ایک دن بہت اچھا کھائیں اور ایک دن بچا ہوا بھی کھائیں اور ایک دن بہت اچھے کپڑے پہنیں تو دو دن ایسے کپڑے پہنیں کہ آپ خود کو بھی اچھی نہ لگیں۔ نفس کو موٹا نہیں کرنا۔

اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہم پر بھی رحم کردے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ۔ مَا غیر عاقل کے لیے آتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسکو بہت چھوٹے لیول پہ لے کے کہا کہ تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو، اللہ کی مانو تو تب سمجھ آئے گی۔

اب اس کے بعد آیت 51 میں عزیزِ مصر کی بیوی کا ایک جملہ تھا اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ ہاں یہ میں ہی تھی جو اس کو اپنے نفس سے مائل کرتی تھی اور یہ سچا ہے۔ تو یہاں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ عورت ہی کا کلام ہے اور یہ سب کچھ حضرت یوسفؑ کی غیر موجودگی میں بادشاہ کے سامنے ہو رہا ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے اس عورت کا اقرارِ جرم نہ کرنا اُس وقت بہتر تھا کیوں کہ اللہ تعالیٰ ساری پبلک کے سامنے اس سے اقرارِ جرم کروانا چاہتے تھے، تاکہ سب کے سامنے یوسفؑ کی بے گناہی ثابت ہو جائے۔ اب یوسفؑ جیل میں قیدیوں نے خواب سُنایا، پھر بادشاہ کو خواب آگیا، اُس

خواب کی تعبیر کی صورت میں آج کی زبان میں یوسفؑ کو کچھ کورتج ملی اور وہ میڈیا پہ آ گئے۔ یوسفؑ نے باہر آنے سے انکار کر دیا اس سے بھی شہرت پھیلی، اب مقدمہ چلا اور عورتوں نے الزام اپنے اوپر لیا۔ اب یوسفؑ پوری طرح مشہور ہو گئے۔ جب اس طرح یوسفؑ کی شہرت پھیلی تو بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ یوسفؑ تو جیل میں پڑا ہیرا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾

بادشاہ نے کہا "اُنہیں میرے پاس لاؤ تا کہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں" جب یوسفؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسا ہے"۔

بادشاہ نے کہا کہ میں اسے اپنا خاص بندہ بناؤں گا۔ أَسْتَخْلِصْهُ، یعنی میرا سیکریٹری، ہو گا، میرے سیکریٹس اس کے پاس ہوں گے۔ پہلے جب تک لوگوں سے قصے سُنے تھے تو بادشاہ کا خیال تھا کہ میرے درباریوں میں شامل ہو جائے گا، لیکن جب بات کی تو یوسفؑ کی وہ خوبیاں سامنے آئیں کہ کہا أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ تو بڑی چھوٹی بات تھی۔ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ۔ یہ تو اور معتبر شخص ہو گا۔ گفتگو انسان کے اندر کا ڈھکن ہوتی ہے۔

ہم سب خود کو اپنی گفتگو کے آئینے میں پہچانیں۔ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اتنی عمر ہونے کے باوجود آج تک ہم نے خود کو بھی نہیں پہچانا۔ بعض دفعہ ہم اندر سے سچے، کھرے ہوتے ہیں لیکن ہماری گفتگو ایسی ہوتی ہے جو ہمارے اندر کے کردار کا ثبوت نہیں دیتی۔ جب کھانا بنتا ہے تو سب سے

پہلے ہمیں اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔اسی طرح گفتگو خوشبو ہے۔ہم بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن گفتگو کے میدان میں ہار جاتے ہیں۔ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ سے پوچھے جب میں دوسروں سے بات کر رہی ہوتی ہوں تو کیا لگ رہی ہوتی ہوں۔میرا پتہ میری گفتگو سے چلے گا۔

یہ شیطان کا بہت بڑا ہتھیار ہے کہ گفتگو میں بڑے بڑے لوگوں سے ایسی غلطیاں کروادیتا ہے اور پھر اس پہ خوش ہوتا ہے۔ہم اپنے آپ کو گفتگو میں کیسے پہچان سکتے ہیں؟سب سے پہلے تو اپنے گھر والوں میں،بچوں سے بات کرتے ہوئے،شوہر سے،سسرال سے بات کرتے ہوئے کہ ہم کس طرح بات کرتے ہیں۔جب میری کسی سے بات بگڑتی ہے،کوئی اختلافِ رائے ہو گیا،تو میں کس طرح اپنی بات کا یقین دلاتی ہوں؟چیخ کے،غصہ سے،تیوریاں چڑھا کے،یا خاموشی کے ساتھ؟

کبھی اپنے الفاظ ضائع نہ کریں۔تب بولیں جب لوگ آپ کو سُننا چاہیں۔پہلے ٹمپریچر چیک کریں،پھر بولیں۔یوسفؑ کی بات سے بادشاہ اُنکو پہچان گیا۔یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بادشاہ بھی عقل مند تھا۔پہلے بھی اُس پہ خواب کا اثر نظر آتا ہے۔کچھ لوگ اللہ کو تو نہیں پا لیتے لیکن دنیاوی انسانوں کو پرکھ لیتے ہیں۔اُس نے حضرت یوسفؑ کو اپنے پاس آنے کی دعوت دے دی۔

ہم اکثر گلہ کرتے ہیں کہ ہماری داڑھی یا بُرقع دیکھ کے لوگ بدل جاتے ہیں لیکن اگر انسان کا کردار یوسفؑ کی طرح ہو تو ایسا نہیں ہوتا۔اُن کو تو بادشاہ خود اپنے پاس بٹھا رہا ہے۔آج مسلمان سے کردار کی طاقت کھو گئی۔علامہ اقبال نے کیوں دعا دی تھی

کہ خدا تجھے جدتِ کردار دے

اے مسلمان اللہ تجھے کردار کی وہ خوبصورتی دے دے کہ تجھے منزل خود پُکارے۔

آج ہم کردار کے نہیں گفتار کے غازی ہیں۔ بڑھکیں مارتے ہیں۔ ہمیں بڑا گمان ہیں کہ ہم مسلمان ہیں ، اُمتِ محمدیؐ ہیں لیکن ہر میدان میں پیچھے ہیں۔ یوسفؑ والی خوبیاں اگر انسان کے اندر ہوں تو بادشاہ اُنہیں کہہ رہا ہے آپ میں بڑی خوبیاں ہیں۔ یوسفؑ کو اللہ تعالیٰ نے خوبیاں دی تھیں۔ جیل میں اُنہیں "صدیق" کا لقب ملا۔ ہر نبی کو صادق اور امین کا لقب ملا۔

جیسے نبیؐ کے بارے میں ہے کہ لوگ آپکو نبوت سے پہلے بھی صادق اور امین کہتے تھے۔ حضرت یوسفؑ کو صادق کا لقب تو جیل میں ہی مل گیا۔ اب بادشاہ اُنہیں کہہ رہا ہے اَلۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ۔ اب امین کا لقب ملا۔ اللہ نے اُن سے نبوت کا کام لینا تھا۔ اُن پر لگا ہوا الزام دھونا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ بادشاہ خود یوسفؑ کو آفر کر رہا ہے۔

ہمیں صحیح وقت پہ صحیح کام کرنا نہیں آتا۔ آج مسلمان اِس بات کو بھول گئے۔ اللہ نے ہمیں دن میں پانچ وقت کا شیڈول دیا۔ جس سے ہماری زندگی بڑے خوبصورت طریقے سے سنور سکتی تھی۔ فجر پہ اُٹھ جاؤ اور عشاء کے بعد سو جاؤ۔ یہ کامیابی کی ایسی کنجی ہے کہ جو ہماری آدھی سے زیادہ بیماریوں کا علاج ہے، آدھے سے زیادہ غموں کا علاج ہے۔ جب ہم فطرت کے قانون کو توڑتے ہیں تو ہم نہ دین کے رہتے ہیں نہ دنیا کے۔ حضرت یوسفؑ کے کردار میں حقیقت میں ایک بندۂ مومن نظر آتا ہے۔

بادشاہ نے کہا کہ آپ میرے پاس مکین اور امین ہیں۔ یوسفؑ کچھ بھی مانگ سکتے تھے۔ لیکن دیکھیں کہ وہ کیا مانگ رہے ہیں۔

قَالَ اجۡعَلۡنِىۡ عَلٰى خَزَآٮِٕنِ الۡاَرۡضِ‌ۚ اِنِّىۡ حَفِيۡظٌ عَلِيۡمٌ ﴿۵۵﴾

یوسفؑ نے کہا، "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔

آپ سوچیں گے کہ دیکھا جاتے ہی کہہ دیا کہ مجھے وزیرِ خزانہ بنا دیں۔ حالانکہ یہاں خَزَآئِنِ الْاَرْضِ سے مراد ذراعت ہے۔ یوسفؑ نے جو عہدہ مانگا وہ زراعت سے متعلق تھا۔ کیوں کہ یوسفؑ کو اُس خواب کی روشنی میں پتہ تھا کہ اس ملک پر ایک بڑا سخت وقت آنے والا ہے اور اس ملک پر ایسی قحط سالی پڑے گی کہ جب تک کوئی عقل مند، مخلص وزیر نہ ہوا، اُس پر قابو نہیں پایا جا سکے گا۔ یعنی دنیا کی علم بھی ہو اور آخرت کا خوف بھی ہو، تو وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ آپ سوچیں کہ ڈوبتی کشتی کا کون ملاح بنے گا؟ کوئی لالچی نہیں بلکہ جس کے دل میں درد ہو گا۔ یوسفؑ کو اللہ نے تاویل الاحادیث دی تھی، معاملہ فہمی تھی، خدا کا خوف تھا، نیک باپ کی اولاد تھے، تو حضرت یوسفؑ کو سمجھ آ گیا کہ ان حالات میں ملک کا کنٹرول اگر کسی ایسے بندے کے ہاتھ میں چلا گیا جو مخلص نہ ہو، جسے کام نہ کرنا آتا ہو تو یہ ملک ڈوب جائے گا۔

دعا کیجیے کہ ہمیں آج کے دور میں ایسے یوسف مل جائیں۔ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ان دو خوبیوں والے لیڈر چاہئیں۔ ان دو خوبیوں والے لیڈر مل جائیں تو آنے والے چند سالوں میں اپنی خوبصورت پالیسیز کی وجہ سے دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ یہاں سے ایک چیز اور ملتی ہے کہ یوسفؑ نے خود عہدہ نہیں مانگا۔ کچھ لوگ یہاں آ کے تفسیروں میں اعتراض کرتے ہیں کہ نبیؐ نے کہا کہ جو تم سے عُہدہ مانگے اُس کو نہ دو۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو تم سے بڑائی مانگے اُسکو نہ دو۔ ہمارے ہاں جو ووٹ کے نام پہ گھر گھر جا کے وعدے کیے جاتے ہیں وہ جائز نہیں۔ اسلام اس کے خلاف ہے۔ یوسفؑ نے خود کچھ نہیں مانگا بلکہ

بادشاہ کچھ دینا چاہتا تھا۔ یوسف ؑ نے اپنی خوبیاں بیان کیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر کہیں کسی کام کے لیے آپ کو اپنی سی۔ وی دینی پڑے تو پھر آپ اپنی تمان خوبیاں لکھیں۔

مفسرین کہتے ہیں کہ یوسف ؑ کے اپنی اُن خوبیوں کا ذکر کیا جن کا بادشاہ کو بھی علم نہیں تھا۔ حَفِيظٌ بھی ہوں اور عَلِيمٌ بھی ہوں۔ یہاں سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگر ضرورت پڑے تو انسان اپنی خوبی کا اظہار کر سکتا ہے، بجائے اس کے کہ پیچھے ہٹے۔ یہ بھی غلط بات ہے کہ انسان کو کوئی ذمہ داری ملے اور وہ کہے کہ نہیں میں نہیں کر سکتی۔ کچھ لوگ سوچتے ہیں ہم یہ عاجزی کے لیے کر رہے ہیں۔ عاجزی کے لیے نہیں کر رہے ہوتے بلکہ سُستی ہوتی ہے کہ ایسے ہی ذمہ داری پڑ جائے گی۔ یہاں یہ بات یاد رکھیئے کہ حضرت یوسف ؑ کو سات سال جیل میں رکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک آنر کے ساتھ مصر کے تخت پر بٹھا رہا ہے۔ پیچھے ہم نے پڑھا کہ یوسف ؑ نے ایک قیدی سے کہا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اور وہ شخص بھول گیا۔ تو وہ کیوں بھولا؟ اس لیے کہ شیطان نیکی کی باتیں بُھلا دیتا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آپ جتنا مرضی شور مچالیں کچھ کام اپنے وقت پہ ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سارے کام ٹھیک ہو رہے ہیں لیکن ایک بچے کا رشتہ ہی نہیں ہو رہا، گھر نہیں مل رہا، تو ایسے وقت میں صبر کریں۔ اللہ چاہتا ہے کہ جلدی مچانے کی بجائے انتظار کریں۔ بعض دفعہ ہمارے لیے چیزیں تیار ہو رہی ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ہم نے اچھی چیز مانگی ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بہترین چیز دینی ہوتی ہے جس کے لیے وہ انتظار کرواتا ہے۔ یوسف ؑ کا کردار بالکل ایسا ہے۔ صدیق، سچا، کھرا۔ دل کا سچا، زبان کا سچا۔ اللہ نے جیل کی تنہائیوں میں ایسی خوبصورت تربیت کروائی کہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یوسف ؑ اس ملک کے لیئے مخلص ہوں گے۔

یہاں ایک بات نوٹ کیجیئے کہ اگر یوسف ؑصدیق نہ ہوتے اور حفیظ اور علیم نہ ہوتے تو وقتی طور پر یوسف ؑکا بادشاہ پر امپریشن پڑ جاتا لیکن تھوڑے دن میں ٹوٹ جاتا۔ یہ محض سوچ ہوتی ہے کہ آپ کسی کو باتوں سے مائل کر لیں گے۔ اگر آپ کے دل پہ کچھ لوگ حکومت کر رہے ہیں تو خود سے پوچھیئے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اُن لوگوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ اس چیز کے مستحق ہیں۔ پیار تو ماں سب بچوں سے کرتی ہے لیکن جو بچہ صدیق ہے، کھرا ہے آپ کو اُس سے زیادہ محبت ہو گی۔ یہ وہ خوبی ہے جو دل میں آ جائے تو کوئی آپ کو ہرا نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف ؑکے ذریعے ہم سب کو بتا دیا کہ تم صدیق بن جاؤ۔ دنیا کے اندر بے تاج بادشاہ بن جاوٴ گے۔

مختلف ملکوں میں ریٹائرمنٹ کی عمر مختلف ہے لیکن اسلام اس چیز کو نہیں مانتا۔ حضرت ابو بکر صدیق ؓ حضرت عمر ؓ، عثمان ؓ اور علی ؓ، یہ اپنے ڈیتھ بیڈ تک لیڈر رہے۔ اسلام میں ووٹنگ نہیں ہے۔ اسلام جب کوئی لیڈر تیار کرتا ہے تو مرتے دم تک اُس سے کام لیتا ہے۔ 65 تک انسان ریٹائر نہیں ہوتا بلکہ اُس کی صلاحیتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک سسٹر کے شوہر بیمار تھے تو کمپنی والوں نے کہا کہ ہم ان کو جلدی ریٹائر کر دیتے ہیں۔ تو اُن سسٹر نے کہا کہ ریٹائر ہو کے یہ گھر بیٹھ کے کیا کریں گے۔ اسلام کے نظریات آج کے حالات سے مختلف ہیں۔ حضرت یوسف ؑکی ساری آزمائشیں چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ یوسف ؑپر جتنی آزمائشیں آئیں یہ سب لوگوں کے اندر رہیں۔

یہ سب سے مشکل تجربہ ہے کہ کسی کو لوگوں کے بیچ مین رہتے ہوئے آزمائشیں آئیں۔ اگر شوہر کچھ کہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کے سامنے کچھ نہ کہنا۔ بچے بھی کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے دوستوں کے سامنے کچھ نہ کہیں۔ یوسف ؑکو دیکھیں کہ پہلے ایک سکینڈل پھر الزامات، پھر دوسری مشکل۔

مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آج کے دور میں لیں تو یوسفؑ کے نام کا ایک اخبار چھپ چُکا ہوتا۔ جس پر اتنے الزام ہوں اُسکو ایک بادشاہ خود آفر کر رہا ہے۔ یہ ہے خوبصورت نقطہ۔ تو آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اگر آپ پہ کوئی الزام لگے یا کوئی بات کرے تو اللہ پہ چھوڑ دیں۔ یہی اگر یوسفؑ کنعان میں رہتے، شادی ہو جاتی اور اپنی بیوی کو لے کے بادشاہ کے پاس آتے کہ مجھے نوکری چاہیئے تو کیا بادشاہ دیتا؟ یوسفؑ کے ذریعے مصر میں ایک انقلاب کا دروازہ کُھل رہا تھا۔ اُن کی پوری زندگی بدل رہی ہے۔ بادشاہ سے لے کر مصر کا بچہ بچہ یوسفؑ سے واقف تھا۔ یوسفؑ ضرب اُلمثل بن چُکے تھے۔ یوسفؑ اتنی آزمائشوں کے باوجود راست باز، حِلم، عالیٰ ظرف، ذہانت، فراست، معاملہ فہمی، کوئی ان کا مقابل نہیں تھا۔ ہم پہ ذرا سی مشکل آئے تو ہمارا موڈ ہی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ہم تو یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ میرا تو دماغ ہی کام نہیں کرتا، اتنی مشکلیں آئیں کہ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ یہ ہمارے اندر کی خود ساختہ باتیں ہوتی ہیں۔ کبھی بھی بُرے حالات کا شکوہ کر کے اپنی شخصیت کی خوبیوں کو ضائع نہ کریں۔ جو ہے وہ آپ کے باہر ہے۔ کنول کا پھول کیچڑ میں کِھلتا ہے۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ماحول اتنا بُرا تھا، مجھے انہوں نے اتنا دبایا کہ اب میرے اندر اعتماد ہی نہیں رہا۔ آپ سٹرونگ رہیں۔ آپ کے اندر اگر خیر ہو گی تو فائدہ ہو گا۔

آپ دیکھیں کہ وقت کا بادشاہ یوسفؑ کے آگے ہتھیار ڈالتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُس کو سمجھ آچکی ہے کہ یوسفؑ اب میری ضرورت بن چکے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب لوگ استعفے دینے لگتے ہیں کہ اب ملک کے حالات خراب ہو رہے ہیں تو ہم یہاں سے نکلیں۔ یوسفؑ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو

سکھادیا کہ مخلص بن جاؤ۔ اگر آپ کسی بھی چیز کو اُس کے حق کے ساتھ کرتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ اُس کو اپنے لئے اور دوسروں کے لیے ایک ناگزیر چیز بنادیتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٦﴾

اس طرح ہم نے اُس سرزمین میں یوسفؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا ۔

یہاں الْاَرْضِ سے کیا مراد ہے؟ مصر۔ ہم نے یوسفؑ کے قدم مصر کی سرزمین ہر جمادیئے۔

مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۔ جہاں چاہے قدم جمالیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ مصر میں قدم جمانے کا یہ دوسرا موقع ملا۔ کنوئیں سے نکالتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کیا کہا تھا؛ ہم نے یوسفؑ کو کنوئیں سے نکال کے عزیزِ مصر کی شفقت میں دے دیا۔ پھر وہاں سے نکلے تو جیل میں گئے اور اب سات سال کی قید کے بعد یوسفؑ کو وزیرِ ذراعت بنادیا۔ ایک بدو ماحول میں پیدا ہونے والا بچہ ایک سُپر پاور ملک کا وزیر بن جائے، یہ اللہ کی شان ہے۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٧﴾

اور آخرت کا اجر اُن لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے ۔

اگر اس مسئلے کو سمجھ گئے تو حقیقت میں ہم نے یوسفؑ کی کہانی سے اپنے لیے بہترین سبق لے لیا۔ حالات کے اتنے تھپیڑے اس کام کے لیے تھے۔ ایک شعر کا مفہوم ہے کہ حادثہ اچانک نہیں ہوتا، وقت برسوں انتظار کرتا ہے۔ یہ ہم کہتے ہیں کہ بس اُلٹی تو حادثہ ہو گیا، بچے کا گھر چھوٹ گیا، یہ آپکو نہیں پتہ ہوتا لیکن وقت کب سے انتظار میں ہوتا ہے، ان حادثات کے لیے۔

ایک سسٹر تھیں تو اُن کی شادی ایک غیر دیندار گھرانے میں ہو گئی، شوہر نے قدر نہ کی اور دوماہ بعد وہ بچی گھر آ گئی۔ بہت پریشان رہنے لگی لیکن اللہ نے اپنی رحمت سے ایسا سبب لگایا کہ اُس کی ایک نہائیت نیک دیندار لڑکے سے شادی ہو گئی۔ اُسکا کہنا تھا کہ مجھے یقین نہیں آتا۔ پہلا شوہر کہتا تھا کہ مجھے تمہاری شکل اچھی نہیں لگتی اور دوسرا کہتا ہے کہ تم سے پیاری کوئی دنیا میں ہے ہی نہیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم کھرے ہوں اور یہ سب تب ملتا ہے جب مشکل حالات میں اللہ سے خوش رہیں۔

معرفت کا اعلیٰ درجہ ہے کہ اللہ کے فیصلوں پہ "الحمدُللہ" کہنا سیکھ لیں۔ ہم جن موقعوں پہ اپنا سارا حوصلہ گرا چکے ہوتے ہیں، ہماری ساری روحانیت ختم ہو چکی ہوتی ہے، وہ وقت ہماری بلندی پہ اُٹھنے کا ہوتا ہے۔ اللہ کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ جنہوں نے دنیا میں بڑے کام کیئے، اُن کو ضرور کوئی ایسی ٹھوکر پڑی۔ محدثینِ اکرام کی زندگیوں کو پڑھ کے دیکھیئے۔ وہ ہماری طرح نازک مزاج نہیں تھے جو اپنے نفس کے گھوڑے کو ہی آج تک نہیں باندھ سکے۔ یا اگر ہم نے اس قرآن کی قدر نہ کی تو ہمیں اس سے کچھ نہیں ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے یوسفؑ کی طرح بنیں،

آپکی بچیوں کا روشن مستقبل ہو تو اُن کے اندر یہ خوبیاں پیدا کریں۔ اللہ سے تعلق جوڑے بغیر بندوں سے تعلق نہیں جُڑ سکتا۔ آپ قرآن پڑھنے لگ گئے ہیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں نفس دَب گیا ہے۔

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ ایک جاہل کا نفس ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ اُسکو چار باتیں سُنا دو تو وہ کہتا اور سُنالو۔ سارے سُناتے ہیں تم بھی سُنالو۔ اور جس کو چار لفظ آ جائیں یا چار پیسے آ جائیں وہ کہتا ہے تم نے بات کی کیسے۔ آپ جتنا زیادہ قرآن پڑھتے جائیں گے نفس اور زیادہ اکڑے گا۔ بظاہر آپ بڑا کہیں گے ہم نرم مزاج ہو گئے لیکن شیطان آپکے اندر نفس کی صورت میں آئے گا۔ تو اس کو ہر روز کچلیں۔

نبیؐ نے دعائیں سکھائیں۔ اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِی رُشْدِیْ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ۔ اے اللہ میرے نفس کو اپنا تقویٰ دے دے۔ اے اللہ میں تیری رحمت کی اُمیدوار ہوں، مجھے ایک پلک جھپکنے کے لیئے میرے نفس کے حوالے نہ کرنا۔

وہ ایک ہی لمحہ ہوتا ہے جب ہم اپنا صبر ختم کر کے چھت سے زمین پہ آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ دے۔ آمین

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا

قیامت کے دن بہت سے لوگ آپنے آپ کو کوس رہے ہوں گے۔ کاش میں نے کچھ آگے کی فکر کی ہوتی۔ سورۃ فرقان میں آتا ہے اے کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔

یہ نفس ہمیں جینے نہیں دیتا اور اسی نے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکلوایا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت کرے۔ آمین